اِسلام اور اِکتشافاتِ حاضرہ

مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط

جس طرح فنِ تشریح کی مدد سے جسمانی اعضاء کے وظائف معلوم کیے جاتے ہیں اور یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ بدن کے ارکان میں تعامل کی کیا شکل ہے، اسی طرح اگر دماغ پر تشریح وتحلیل کا عمل جاری کیا جائے تو انسانوں کے عقلی مدارج اور ذہنی تفاوت کا حال آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی فہم میں تفاوت ہے، اور یہ تفاوت ہماری نظری اور عملی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے حواس خمسہ ہمارے نظامِ عصبی، ہمارے حافظہ وادراک اور امتیاز واستنباط کی قوتوں میں جو مدارج نظر آتے ہیں وہ اسی عقلی تفاوت کے مظاہر ہیں۔ اوسط عقل کے دو انسان بھی ایسے نظر نہ آئینگے جن کی نظر وفکر میں ہم آہنگی ہو اور اُن کی دماغی سطح مساوی طور پر ہموار ہو۔ اسی وجہ سے ہمارے طریقِ استنباط، طرزِ فکر اور انداز گفتگو کی راہیں مختلف ہوگئی ہیں۔ اور ہمیں سیدھے سادے مسائل کو حل کرنے میں دشواریاں پیش آجاتی ہیں۔

مگر فہم کا یہ تفاوت بالکل قدرتی ہے۔ یہ ایک ایسا رخنہ ہے جسے انسانی علم پُر نہیں کرسکتا۔ انسان غور وفکر کی عادت ڈال کر فہم کو جِلا دے سکتا ہے مگر دوسرے کا انداز فکر اختیار کرکے اپنا دماغ دوسرے کے سر میں نہیں اُتار سکتا۔ تعصب، ضد، ماحول کے اثرات اور خود غرضی سے دامن بچاکر انسان عقل کا فانوس روشن کرسکتا ہے، مگر حقائق تک پہنچنے کے لیے کسی معین طریقِ کار کو اختیار نہیں کرسکتا۔ فہم کا یہ تفاوت کوئی مرض نہیں ہے جسے دور کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہو بلکہ

اصلی مرض یہ ہے کہ انسان یا تو اپنے معدۂ فکر کو اتنا کمزور بنالے کہ عقل کی معمولی سی غذا بھی ہضم نہ کرسکے یا پھر اس کے لیے ایسی غذا بہم پہنچائے جسے قدرت نے ہضم کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ وہ انسان جو سرے سے عقل کے استعمال کو ترک کر دیتا ہے، اُس انسان سے ہرگز مختلف نہیں ہے جو عقل سے وہ کام لینا چاہتا ہے جس کے لیے وہ پیدا نہیں کی گئی۔ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ وہ عقل کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھیگا مگر دو قدم کے بعد ہی عقل کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل جاتا ہے۔ پہلی راہ جمود اور کورانہ تقلید کی ہے جس میں حواس کا تعطل بالکل نمایاں ہو جاتا ہے اور دوسری راہ ریب و تذبذب خرص و تخمین کی ہے جس میں عقل کے گھوڑے کو پانی پر چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلی قسم کے انسان کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے، دوسروں کے کانوں سے سُنے، دوسروں کے دماغ سے سوچے اور دوسروں کے اوہام و ظنون پر بلا تامل ایمان لے آئے دوسری قسم کا انسان کوشش کرتا ہے کہ دماغ سے دیکھے، کان سے سوچے اور آنکھوں سے سُننے کا کام لے! اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں کا انجام ایک ہے، یعنی جہالت، کورچشمی، ریب و تذبذب، خرص و تخمین۔ وفی کل وادٍ یہیمون!

پہلے گروہ کے متعلق قرآنِ کریم کا فیصلہ یہ ہے:-

لهم قلوب لا یفقهون بها ولهم — ان کے پاس عقل تو ہے مگر اس سے سوچتے نہیں، آنکھیں
اعین لا یبصرون بها ولهم اذان — ہیں مگر بند کر رکھی ہیں، کان ہیں مگر اُن سے سُننے کا کام
لا یسمعون بها اولئك کالانعام — نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جو حیوانوں کی مانند بلکہ
بل هم اضل۔ — اُن سے بھی بدتر ہیں۔

دوسرے انسانوں کے متعلق ایک اصول واضح فرما دیا۔

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه — وہ جس چیز کا ادراک و احاطہ نہ کرسکے اس کی تکذیب پر آمادہ ہوگئے!

ہمیں یہاں پہلی قسم کے انسانوں سے زیادہ بحث نہیں۔ فی الحال دوسری قسم کے انسانوں سے ہمارا خطاب ہے۔ جان بلنگز نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

"انسان کی سب سے بڑی مصیبت اُس کی جہالت نہیں ہے بلکہ وہ علم ہے جسے غلط استعمال کرنے کی مشق بہم پہنچالی گئی ہو"

حقیقت میں عقل ایک ایسا جوہر ہے جس کی نگرانی تو ہونی چاہیے مگر ہمت افزائی نہ ہونی چاہیے اس کی نگرانی کے بجائے ہمت افزائی کرنے والے اس کا کوئی دائرہ مقرر نہیں کرتے، اور اسے ہر میدان میں دوڑانے، ہر مقام پر لیجانے اور ہر حال میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقل تو اپنی سرحد سے آگے قدم نہیں رکھتی مگر وہ خود اُسے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ عقل و بصیرت اُن کی دستگیر ہے اور فہم و ادراک ہر قدم پر ان کا استقبال کر رہے ہیں غور سے دیکھو کہ انسان کی یہ دونوں حالتیں عقلی فساد کی جڑ ہیں۔ پہلی حالت نے انسان پر غور و فکر کے دروازے بند کر دیے، ان کی دماغی روشنی گل کر دی اور اس پر آفاق و انفس کو تاریک بنا دیا۔ دوسری حالت نے انکار وجود کی راہ پیدا کر کے منافقین و مذبذبین کا گروہ پیدا کر دیا اور انہیں ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اضطراب و انکار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

سائنس اور عصری علوم

علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے بلاشبہ قدیم نظریات کی عمارت متزلزل کر دی ہے مگر کائنات کے اسرار ابھی تک سربستہ ہیں اور غالباً حیات انسانی کی آخری منزل تک سربستہ رہینگے۔ سائنس نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ عقلی اور مادی دنیا میں وہ ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں نظریات، قیاسات اور خیالات کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور صرف تجربہ اور مشاہدہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کر کس طرح سکتی ہے جبکہ اُسے معلوم ہے کہ انرجی (Energy)۔ الیکٹران (Electron)، سلسلہ علت و معلول، سالمات، وقت اور زمانہ (time & spare) جن پر سائنس کی بنیاد ہے۔ ابھی تک عقل و فہم کی دسترس سے باہر ہیں۔ زندگی جو انسان سے

سب سے زیادہ قریب اور واضح حقیقت ہے سائنس اس کی کیفیت و نوعیت اور اُس کی ابتدا کا اب تک پتہ نہ لگا سکی، اور بقول ٹی ایچ ہکسلے شاذ آئندہ بھی اس کا پتہ نہ لگا سکے گی۔ جے۔ ڈبلیو۔ این سلیون نے کہا ہے کہ

"انسان کے گہرے مسائل سائنس کی سرحد سے باہر واقع ہیں۔ سائنس تو محض ایک ابتدائی کوشش ہے اور اُس کی تمام "سچائیاں" مشروط ہیں[1]"۔

جولین ہکسلے کو اقرار ہے کہ

"ہم صرف مظاہر تک رسائی حاصل کر سکے ہیں اور جہاں تک سائنٹفک تحقیقات کا تعلق ہے ہمارا سسٹم صرف مظاہر کی تشریح اور ترجمانی کرتا ہے۔ سائنس کی حقیقت آزادانہ تحقیقات اور تجربات میں مضمر ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے اصول و بنیادی غیر متغیر ہیں۔ اس میں حذف و اضافہ اور ترمیم کا ہر وقت امکان ہے[2]"۔

یہی وجہ ہے کہ سائنس کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ کائنات کی حقیقت اور موجودات کی ماہیت کیا ہے تو اُس کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہو گیا اور حکماء کو اقرار کرنا پڑا کہ کائنات کی حقیقت کا معاملہ سائنس کی حد سے باہر ہے۔ کیپلر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے دماغ کی فطری ساخت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت کا ادراک کر ہی نہیں سکتے۔ ہماری رسائی صرف کمیت تک ہے، کیفیت ہماری حدود سے خارج ہے[3]۔ اگر کسی نے ذرا ہمت سے کام لیا تو صرف یہ کہا کہ فلاں چیز کائنات کی حقیقت میں داخل ہے۔ مثلاً نیوٹن کے نزدیک وقت، جگہ اور مادہ (time - space - mater) ہی کائنات کی حقیقت ہیں۔ مگر گلیلیو کہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت صرف سالمات (Atoms) ہیں

---

[1] Limitation of Science ص ۲۱۳

[2] Essays of a Biologist ص ۱۸۰ و ص ۱۹۳۔

[3] Limitation of Scienc ص ۱۷۰

جو سائز، صورت اور حرکت پر مشتمل ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود وقت کیا ہے؟ جگہ یا خلا کی ماہیت کیا ہے؟ اور مادہ کی حقیقت کن اجزاء پر مشتمل ہے؟ اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے۔

جس چیز کا ادراک انسان کے لیے بالکل بدیہی ہے وہ زندگی ہے مگر کیا سائنس اس راز کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے؟ زندگی کی حقیقت تک رسائی تو خیر بہت مشکل ہے، اس نے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا! مسٹر ایچ۔ جی ویلز کا بیان ہے کہ

"بہت سے سائنس دانوں نے زندگی کے آغاز کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اب تک اس کے متعلق کوئی قطعی علم حاصل نہ ہوسکا"[1]۔

تھامس ہنری ہکسلے نے ذرا وضاحت سے اعتراف کیا ہے کہ

جب ہم پچھلے زمانہ کی طرف مڑکر دیکھتے ہیں تو ہمیں زندگی کے آغاز کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہوتا اور اس لیے ہم اُس کے ظہور کی کیفیت پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرسکتے[2]۔

ڈارون کو بھی بالآخر یہی کہنا پڑا کہ یہ ہم سے مت پوچھو کہ زندگی کی ابتدا کب ہوئی! کیونکہ اس امر خاص میں ہم سب قطعی جاہل ہیں! لارڈ کالون نے قیاسی گھوڑے دوڑا کر صرف اتنا بتایا کہ ہماری زمین پر زندگی کا تخم کسی سیارہ سے آیا ہے۔ مگر سوال تو یہی ہے کہ کسی اور سیارہ میں زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟ سوال آغاز کا ہے مکان کا نہیں ہے!

جس سائنس کا حال یہ ہو کہ وہ مظاہر سے باہر قدم رکھنے کا نام تک نہ لیتی ہو اس سے الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل حل کرانا عقل و دانش کا نہایت ہی بھدا مظاہرہ ہے! مگر ہمارے "روشن خیال، وسیع النظر اور تعلیم یافتہ" حضرات کو اصرار ہے کہ وحی و نبوت، حیات بعد الموت، نیکی اور بدی، سزا اور جزا اور عالم ملکوت کے جملہ مسائل کو تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر کس کر دکھاؤ یا سائنس سے اقرار کراؤ کہ وہ بھی ان حقائق پر

---

[1] A Short History of the World ص ۱۰۔ [2] تھامس ہکسلے ڈائری ص ۳۲۵

ایمان رکھتی ہے! اور چونکہ سائنس کو اب تک ان حقائق کے تسلیم کرنے میں تامل ہے لہٰذا روشن خیالی کا تقاضہ یہ ہے کہ مابعد الطبیعاتی مسائل سے قطعاً انکار کر دیا جائے!

گویا انکار وجود کی یہ وہی قسم ہے جسے قرآنِ کریم نے بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ جو حقائق ابھی تک سرحد ادراک سے ماورا رہیں اور عقل کی کوتاہی وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکی ہے اُنہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے! حالانکہ الکٹران (برقیہ) کی تھیوری پر ہمارے روشن خیالوں کا ایمان ہے اگرچہ اُس کا مشاہدہ اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔ قانون کشش کی بحث پر اُن کے علم کا مدار ہے۔ گو اُنہوں نے اس کا تجربہ کبھی کر کے نہیں دیکھا۔ مسئلۂ ارتقاء اور انتخاب طبعی پر انہیں فخر ہے حالانکہ اُنہوں نے کبھی ان مسائل کو تحقیقات کی کسوٹی پر رکھ کر شہود و ظہور کا جلوہ نہیں دیکھا مگر وحی و نبوت اور حیات بعد الموت کے حقائق کو تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ سائنٹفک طریقہ پر انکا مشاہدہ تعلیم یافتہ حضرات کو کبھی نہیں ہوا۔ خبر نہیں یہ مشاہدہ کی کونسی قسم ہے جس کی ایجاد کا فخر ان حضرات کو حاصل ہو گیا ہے۔

گمراہی کا اصلی مخرج ہمارے "روشن خیال" نوجوان کا اصلی مرض یہ نہیں ہے کہ وہ عقل کا استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے اسی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں جہاں وہ کام کرنے کے بجائے معطل ہو جاتی ہے۔ عقل کا استعمال بھی ہو اور اسے اس کے دائرۂ عمل سے باہر بھی نہ نکالا جائے، اس کے لیے متوازی دماغ اور موزوں سانچہ کی ضرورت ہے اور افسوس ہے کہ مغرب زدہ اصحاب کے پاس سب کچھ موجود ہے مگر دماغ کا صحیح سانچہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ایک قاعدہ مسلم بن گیا ہے یعنی عصری علوم اور جدید نظریات کی بنیاد ان یقینیات اور قطعیات پر ہے جن کے غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے! یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس نے روشن خیالوں کی عقلی کائنات کا نظام خراب کر دیا ہے اور ان میں مغرب پرستی کی بنیاد ڈال دی ہے۔ ہم تو تسلیم کرتے ہیں کہ مذہب کے حقائق کو ایسا پختہ، یقینی اور قطعی ہونا چاہیے کہ کوئی تجربہ اور مشاہدہ اس کی تکذیب نہ کر سکے۔ ہمیں یہ بھی مسلم ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف مذہب کی جو بات ہوگی وہ یقیناً باطل ہوگی اور ایسا

مذہب عقیدت کی تکیہ گاہ قرار نہیں پاسکیگا مگر ہمیں اور یورپ کے مفکرین اور سائنس دانوں کو یہ مفروضہ ہرگز تسلیم نہیں ہے کہ جدید علوم کے سائنٹفک نظریات، یقینیات پر مبنی ہیں اور ان کا ہر شخص نے نہیں تو خص الخواص حضرات نے مشاہدہ کرلیا ہے۔

اگر یہ اصول کہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف مذہب کی کوئی بات نہیں ماننی چاہیے، ہمارے اور یورپ زدہ حضرات کے درمیان طے پا جائے تو ہمارا کام بہت ہلکا ہوجاتا ہے۔ ہم صرف اتنا کرینگے کہ ان حضرات کو مخاطب کرکے یہ اعلان کردیں کہ جدید علوم کے وہ کونسے مسائل اور حقائق ہیں جو اسلام سے متصادم ہوتے ہیں؟ نام لو ان حقائق علمیہ کا جو تجربہ اور مشاہدہ میں آچکے ہوں اور اسلام سے متصادم بھی ہوتے ہوں؟ ضرورت نہیں کہ ایسے دس بیس حقائق کی فہرست بنائی جائے۔ ہمارا چیلنج تو یہ ہے کہ سائنس اور علوم جدیدہ کی صرف ایک ایسی حقیقت پیش کرو جو اسلام کے کسی نظریہ یا نظریات سے متصادم ہوتی ہو اور پھر وہ تجربہ کی کسوٹی پر بھی کس لی گئی ہو؟ یہ واضح رہے کہ یہاں سوال سائنس کی ایسی حقیقت سے ہے جو واقعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہو۔ قیاسات اور نظریات کا سوال نہیں جن کے پس پردہ مذہب کے خلاف تیر چلایا جاتا ہے! یعنی Scientific fact پیش کرو Scientific theory پیش نہ کرو کہ وہ خود حکماء کے نزدیک مابہ النزاع ہیں۔ پھر ہم دیکھینگے کہ اسلام سے کس طرح اس کی ٹکر ہوتی ہے!

ہمارا نشانہ پھر سمجھ لینا چاہیے۔ جدید نظریات فی نفسہٖ یقینی اور قطعی ہیں یا محض فرضی و قیاسی؟ اگر فرضی ہیں تو پھر مذہب اور سائنس کا تصادم لازم نہیں آتا اگر قطعی ہیں تو روشن خیالوں کو اُن کی قطعیت کا ثبوت پہلے دینا چاہیے، اگر ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسے جدید نظریات جو مشاہدہ پر مبنی ہوں کبھی پیش نہ کرسکینگے اور جو یقینیات پیش کرینگے وہ اسلام سے متصادم نہ ہونگے۔

تھیوری کیا ہے؟ اصل میں ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات کو ٹھوکر یہاں سے لگی ہے کہ اُنہوں نے اول تو سائنس اور علوم جدیدہ کا عمیق نظر سے کبھی مطالعہ نہیں کیا اگر کیا بھی تو وہ فیکٹس (واقعات) اور تھیوریز (نظریات) میں

فرق نہ کرسکے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک طرف ڈارون کی ایولوشن تھیوری (نظریہ ارتقاء) ہے جس میں قدرت کائنات کے ہر گوشہ میں تحلیل کا عمل کرتی نظر آتی ہے دوسری طرف اسلام کی رو سے کائنات کا ابداع ہے جس پر خالق کی طرف سے تخلیق کا عمل جاری ہے۔ بس اُنہوں نے غور و فکر کے بغیر فوراً یہ نتیجہ نکال لیا کہ سائنس اور مذہب میں ٹکر ہوگئی اور چونکہ سائنس کے حقائق تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہیں لہذا اُن کے مقابلہ پر مذہب کی بات نہیں مانی جاسکتی!۔

اگر یہ حضرات صرف اتنا غور کر لیتے کہ جس عملی نظریہ کی خاطر اسلام سے بدگمانی کی جارہی ہے وہ نہ واقعہ (فیکٹس) ہے اور نہ مشاہدہ سے اُس کا کوئی تعلق۔ بلکہ ایک مفروضہ اور قیاس ہے جو جدید علمی ترقیوں کے بعد کسی مرحلہ پر جاکر غلط ثابت ہوسکتا ہے! مشاہدہ اور تجربہ کا شور تو اتنا بلند کیا جاتا ہے اور مثال میں چیز وہ پیش کی جاتی ہے جس کا مشاہدہ خود ڈارون نے بھی خواب میں نہ کیا ہوگا۔ کیا اس برتے پر سائنس کو مذہب کے مقابلہ پر لاکر کھڑا کیا جاتا ہے؟

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تھیوری (Theory) کی حقیقت کیا ہے اور نظریہ کسے کہتے ہیں؟ اس پر بحث کرتے ہوئے ایک نفسیات کا ماہر انگریز لکھتا ہے۔

"کوئی نظریہ صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ واقعات اصلیہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ غور و فکر، نظریات کی جانچ پڑتال اور اُس کی تشکیل کا نام ہے۔ ہر صحیح نظریہ واقعہ کا عکس ہوتا ہے۔ جو ہے وہ واقعہ ہے، اور ہم جو کچھ غور کرتے ہیں وہ نظریہ ہے اگر نظریہ واقعہ کے ساتھ پورا تطابق رکھتا ہے تو وہ صحیح ہے۔ ورنہ غلط ہے! ایک مخصوص نظریہ ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر ہم کسی نظریہ پر غور کریں تو اُس کے معنی یہ ہونگے کہ ہمارے ہاتھ ایک سانچہ لگ گیا ہے جس میں چند مخصوص واقعات اور چند قوانین کو جو ان پر حکمراں ہیں فٹ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نظریات پر ہمارا اعتماد مشروط ہونا چاہیے اور یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے مقابلہ پر کوئی دوسرے نظریات

تو موجود نہیں ہیں جو واقعات کی تشریح کرنے میں مساوی درجہ رکھتے ہوں[۱]"

اور جے، ڈبلیو سلیون کا یہ فیصلہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ "انسان کے گہرے مسائل سائنس کی سرحد سے باہر واقع ہیں اور اس کی تمام سچائیاں مشروط ہیں" یہاں سائنس سے مراد واقعات نہیں ہیں کیونکہ واقعات کی سچائی مشروط نہیں ہوتی، بلکہ مراد تھیوریاں (نظریات) ہیں جو اگر واقعات پر مبنی ہیں تو اُن کی غلطی کسی نہ کسی وقت ظاہر ہو کر رہتی ہے اور جنہیں قطعیات میں شامل کر لینا پرلے درجہ کی نادانی ہے۔

سائنس کی تھیوریوں پر اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ یورپ کے ایک مشہور سائنس داں نے بحث کی ہے۔ سائنس کی دنیا میں جے بی ہالڈین کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں وہ اپنی ایک کتاب میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے لکھتے ہیں۔

> گذشتہ تجربات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہماری بہت سی سائنٹفک تھیوریاں جن کی عظمت مسلم ہے، جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس قابل ہیں کہ انہیں خرافات (Myths) میں جگہ دی جائے۔ ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کہ ان کا واقعات معلومہ سے کوئی تضاد نہیں اور وہ عملی چیزیں ہیں۔ یہ نظریات ہمیں مادہ کی داخلی فطرت سے آگاہ نہیں کرتے۔ برق پارے (الیکٹران) ممکن ہے کہ روحانیت کے جامہ میں ملبوس ہوں۔ ان کی کیفیات حیرت انگیز ہوں! مگر طبعیات کے ماہرین ہمیں صرف یہ بتلاتے ہیں کہ چند قوانین کے مطابق وہ ایک دوسرے کو دفع اور چند ضوابط کے تحت ایک دوسرے کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ برق پاروں کی ماہیت کے متعلق کچھ نہیں کہتے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کچھ نہیں کہہ سکتے[۲]

تھیوری کے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے سائنسدانوں کے مفروضات اور قیاسات پر غور کیجیے اور خود ہی فیصلہ کیجیے کہ تجربہ اور مشاہدہ سے ان کا کیا تعلق ہے۔ ہماری زمین اور دیگر سیاروں کی پیدائش کے سلسلہ میں بیان کیا

[۱] ای۔ اے منڈر ص۱۰۲ Clearer thinking [۲] جے بی ہالڈین ص۲۱۴ Possible Worlds

جاتا ہے کہ یہ سب آفتاب ہی کے حصے ہیں جو کسی قدیم زمانے میں ایک زبردست حادثہ کے باعث آفتاب سے علیحدہ ہوگئے۔ علم الافلاک کے ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی زبردست اور عظیم الشان ستارہ گذرتا ہوا آفتاب کے قریب آگیا۔ سیارہ کی کشش اتنی زبردست تھی کہ آفتاب کے سیال مادہ میں مدوجزر واقع ہوا اور اُس میں سے مادہ کا ایک بہت بڑا حصہ سیارہ کی کشش کے باعث باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے نکلتے اس مادہ میں بھی تزاحم پیدا ہوا اور اُس کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ بعد میں ان ٹکڑوں نے مریخ، مشتری، زحل، زمین وغیرہ کی شکل اختیار کرلی۔ وہ سیارہ جس کی کشش نے یہ سارا طوفان بپا کیا تھا اپنا سفر طے کرتا ہوا آگے نکل گیا اور یہ سیارے آفتاب کے گرد گردش کرنے لگے!

اب غور کیجیے یہ ایک تھیوری ہے، ایک خیال ہے۔ ایقان اور قطعیت اس کے ساتھ نہیں ہے آخر کیا ضروری ہے کہ اس کی صحت پر اصرار کیا جائے؟ اگر کوئی تیار بیٹھا ہو کہ سائنس کے نام سے مرعوب ہو کر عقل کا دیوالہ نکالدے تو دوسری بات ہے مگر یہ مفروضہ اس قابل نہیں ہے کہ اس پر حقیقت اور قوانین کا اطلاق کیا جائے۔ موجودہ سائنس کے ایک بہت بڑے وکیل نے صاف کہہ دیا ہے کہ

"یہ تھیوری کہ کسی سیارہ کی کشش سے یہ تمام سیارے آفتاب سے برآمد ہوگئے صرف تھیوری ہے حقیقت نہیں ہے"[1]

مسئلۂ ارتقاء اور انتخابِ طبعی

ہم تھیوری اور واقعہ کی بحث میں مزید تفصیل کرنا چاہتے ہیں۔ آج دنیا کے سائنس داں اس امر پر تقریباً متفق نظر آتے ہیں کہ اجسام ذوی الاعضاء (حیوان۔ نباتات) کی اصل ایک ہے اور مختلف انواع نے ایک حالت سے ترقی کرکے ہزاروں اور لاکھوں مدارج کروڑوں بلکہ اربوں سالوں میں طے کیے ہیں۔ یعنی نباتات اور حیوانات کی انواع میں سے ہر نوع دفعۃً اسی طرح ظہور میں نہیں آئی جس طرح وہ آج نظر آتی ہے بلکہ ان پر ارتقاء (Evolution) اور استحالہ کا عمل جاری ہوا ہے۔ شروع شروع میں زندگی کا ظہور پانی میں

[1] جے ڈبلیو سلیون ص۱۱۵ Limitation of science

ہوا اور ابتدا ایسی ذی حیات ہستی سے ہوئی جسے خوردبین سے بھی بمشکل دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نہایت ہی صغیر کیڑے نے انتخاب طبعی (Natural selection) کے ماتحت چولہ بدلنا شروع کیا اور وہ اتنا بڑا ہوا کہ آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ جغرافیائی حالات کی تبدیلی سے یہ کیڑا ہر دور میں متاثر ہوتا رہا اور اس نے آہستہ آہستہ لاکھوں برس میں ہوام الارض کی، لاکھوں برس میں مچھلی اور گرمچھ کی اور لاکھوں برس میں کسی اور آبی جانور کی شکل اختیار کی۔ ان میں سے بعض جانوروں نے پانی سے باہر بھی نکلنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ لاکھوں برس میں آبی سے ہوائی جانور بن گئے اور ہوا سے سانس لینے لگے۔ غرض خشکی کے ان جانوروں نے بھی ماحول سے مطابقت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ارتقاء کی منازل طے کیں۔ تا آنکہ لاکھوں برس کے استحالہ کے بعد وہ بندر سے مشابہ، پھر بندر اور پھر انسان بن گیا اور اس استحالہ پر کروڑوں سال کا زمانہ صرف ہوا۔ یہ ہے مسئلہ ارتقاء جس پر آج دنیا کے بیشتر حکماء کا اتفاق ہے!

مسئلہ ارتقاء کے لیے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شکل ذوی الاعضاء خواہ وہ نباتات ہو یا حیوانات، اس وقت تک تبدیلی قبول نہیں کرتی جب تک کہ ماحول میں تغیر واقع نہ ہو۔ اگر ماحول بدل جائے تو جو حیوانات اس سے مطابقت کر لینگے۔ وہ خود بھی متغیر ہونگے اور زندہ بھی رہینگے۔ اگر ان میں مطابقت کی صلاحیت نہ ہوگی تو وہ مر جائینگے۔ مثلاً اگر کسی بڑے دریا کا پانی یک بیک خشک ہو جائے تو کروڑوں اور اربوں مچھلیاں خشکی پر تڑپتی نظر آئینگی۔ یہ خشکی ان کے لیے ایک نیا ماحول ہے۔ اس ماحول سے جو مچھلیاں مطابقت نہیں کرینگی وہ تڑپ تڑپ کر مر جائینگی اور جو اقل قلیل حصہ پوری جد وجہد کے بعد اس خشک ماحول کو برداشت کر لیگا وہ زندہ رہیگا مگر زندگی کے ساتھ ان کے اعضا میں بھی تغیر واقع ہوگا اور آہستہ آہستہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے اشکال میں اس قسم کی تبدیلی ہوگی کہ ہم انہیں مچھلی ہرگز نہ کہہ سکینگے۔ یہ ہے مسئلہ انتخاب طبعی (نیچرل سلیکشن) جس پر مسئلہ ارتقاء کی عمارت کھڑی کی گئی ہے؟

اس مسئلہ کو حکماء نے متعدد طریقوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً۔

(۱) علم الحیوان (Zoology)

(۲) علم الحیات (Biology)

(۳) علم تشریح الابدان (Anatomy)

(۴) علم الجنین (Ambryology)

(۵) اشیاء متحجرہ کے باقیات کی سائنٹفک تحقیق (Plaeontology)

آخر الذکر طریقہ جو اشیاء متحجرہ کے باقیات کی تحقیقات سے متعلق ہے نہایت دلچسپ ہے اور ہمیں محققین کی پیہم اور مسلسل کوششوں کی داد دینی چاہیے کہ اُنہوں نے زمین کے طبقات کی تحقیقات اور زندہ اشیاء کے ڈھانچوں کی جانچ پڑتال کرکے ایک ایسا علمی ذخیرہ جمع کردیا ہے جس پر موجودہ زمانہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم سائنس داں اور حکماء کی علمی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر بعض وجوہ کی بنا پر اُن کے نتائج سے اتفاق نہیں کرسکتے۔

طبقات الارضی تحقیقات اجسام ذوی الاعضاء (حیوانات و نباتات) کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو بقول ڈریپر "طبقات قدیم تحتانیہ کے متحجرات سے لے کر طبقاتِ جدیدہ فوقانیہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا ہر ایک حلقہ ایک حلقۂ ماسبق سے معلق اور ایک حلقۂ مابعد کا سہارا ہے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ جاندار ہستیوں کا وجود میں آنا ایک مقررہ ضابطہ کے تابع ہے اور یہ وہ ضابطہ ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی" ارتقاء کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان طبقات میں انسانی جسم کے ڈھانچ اور انسانی صنعت کے آثار پائے گئے ہیں انسان کے آثار متحجرہ یعنی ان کے جسم کے ڈھانچ کھردرے ترشے ہوئے مجلا پتھر۔ ہڈی اور نحاس کے اوزار یورپ کے غاروں ریت اور سنگریزوں کے تودوں اور حشیش متحجر کے طبقوں سے کھود کھود کر نکالے گئے ہیں۔ سطح زمین کے بالائی پرت کے ان مقامات میں جہاں کھودنے پر حشیش متحجر کا اینڈھن نکلتا ہے ابھی تک انسان کے آثار پائے جاتے ہیں اور اُن کے اوزاروں سے ان کا تاریخی زمانہ صاف معلوم ہوتا ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے یوں سمجھیے کہ سطح زمین سے تھوڑی گہرائی میں کانسی کے اوزار اور برتن برآمد ہوئے ہیں اور ساتھ ہی انسان کے متحجر ڈھانچے بھی۔ یہ ڈھانچے موجودہ انسان سے کامل مشابہت رکھتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں انسان اپنی ہیئت کذائی کی تکمیل کر چکا تھا۔

سطح زمین کے اس طبقہ سے بھی نیچے طبقہ میں ہڈی اور سینگ کے اوزار پائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایسے انسانوں کے ڈھانچے جو کسی قدر موجودہ انسان سے مختلف ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طبقہ کا انسان شکل و شباہت میں ارتقائی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس طبقہ سے بھی نیچے کے طبقہ میں ترشے ہوئے مجلا پتھر کے اوزار اور رنگین اشیاء پائی گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی ایسے انسانی ڈھانچے بھی جو طبقۂ اول کے انسان سے زیادہ مختلف اور طبقۂ دوم کے انسان سے کم مختلف ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُس دور کا انسان موجودہ انسان سے بہت زیادہ مختلف تھا۔

اس سے بھی نیچے کے طبقہ سے کھُردرے اَن گھڑ پتھر کے اوزار برآمد کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایسے ڈھانچے بھی جو طبقہ اوّل، دوم و سوم کے انسان سے علی الترتیب زیادہ مختلف ہوتے چلے گئے ہیں جب ان سے بھی نیچے طبقات کو کھودا گیا تو وہاں بندر سے مشابہ اشکال۔ اس سے نیچے بندر کے ڈھانچے، اس سے نیچے بندر سے مشابہ حیوانات اور بعد کے طبقات میں دودھ پلانے والے حیوانات کے متحجر آثار موجود پائے گئے اور بندر سے مشابہ حیوان کے بعد جملہ طبقات ارضی میں کسی انسان، کسی بندر اور کسی بن مانس کا ڈھانچہ نہیں پایا گیا۔ گویا اس دور میں جس پر اب کروڑوں اور اربوں سال گزر گئے ہیں، انسان موجود نہیں تھا۔ بلکہ حیوانات انتخاب طبعی کے ماتحت اپنا چولہ بدل رہے تھے۔ لاکھوں سال کے بعد حیوانات نے بندر سے مشابہ شکل اختیار کی۔ لاکھوں سال بعد وہ بندر بنا۔ اتنے ہی عرصہ کے بعد رفتہ رفتہ اُس نے بن مانس کا چولہ بدلا اور یکے بعد دیگرے تغیرات اور تبدلات سے دوچار ہوتا ہوا ایسا انسان بنا جس نے کھردرے پتھروں سے اوزار کا کام لیا اور پھر

لاکھوں ہی برس کے بعد اس نے اعضاء کے تغیر کے ساتھ ترشے ہوئے پتھروں کے اوزار بنائے اور پھر درجہ بدرجہ ہڈی اور دھات کا استعمال سیکھا!

چنانچہ ڈارون نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں آثار متحجرہ کے باقیات اور طبقات ارضی کے نتائج پر نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تمام جانداروں کا ظہور و نمود پانی میں ہوا، سب کی اصل ایک کیڑا (Amphebia) تھا جس نے درجہ بدرجہ لاکھوں سال تک ترقی کی اس نے ہوام الارض (ریڑھ کی ہڈی والے حیوانات مثلاً مچھلیاں) کی شکل اختیار کی۔ اس سے دودھ پلانے والے جانور نمودار ہوئے اور پھر بندر اور پھر انسان اپنے اس درجہ کو پہنچا!

بلاشبہ اس طرز کی عمیق تحقیقات کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہمیں اس امر کے اظہار میں بھی تامل نہیں ہے کہ ہم مسئلۂ ارتقاء کو زیادہ سے زیادہ تھیوری کا درجہ دے سکتے ہیں واقعہ اور مشاہدہ کا درجہ نہیں دے سکتے![1]

اسی بنا پر برگسان (Bergson) نے مسئلۂ ارتقاء کا صاف انکار کر دیا ہے۔ لامارک (Lamark) کا فلسفہ گو ڈارون کے مسئلۂ ارتقاء سے کتنا ہی قریب ہو مگر اس کی اختلافی نوعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

والیس (Wallace) نے جو مسئلۂ ارتقاء کا باوا آدم کہا جاتا ہے اور جس نے اپنی

---

[1] واضح رہے کہ ہمیں یہاں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ مسئلۂ ارتقاء اسلام کے تخلیقی نظریات سے کہاں تک مطابق ہے۔ ممکن ہے کہ اسلام مسئلۂ ارتقاء کا حامی ہو۔ مشہور اسلامی فلاسفر ابن مسکویہ نے غالباً سب سے پہلے مسئلۂ ارتقاء کو تسلیم کیا ہے۔ اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی مسئلۂ ارتقاء کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پادریوں کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان انسان کو اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت سمجھتے ہیں تو انہیں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ڈریپر لکھتا ہے:-

"علمائے دین عیسوی مسلمانوں کے اس قیاس کو کسی طرح بنظر استحسان نہ دیکھ سکتے تھے کہ انسان طبقۂ سافل کی اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ قرنہا قرن تک بتدریج نشوونما پا کر موجودہ درجہ کو پہنچا ہے" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۰۶)

تحقیقات کا سلسلہ ڈارون کے ساتھ ساتھ شروع کیا تھا، فروعات میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انتخاب طبعی کے ماتحت انسان اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ضرور ہے، مگر انسان کا دماغ اور اُس روح حیوانی نہیں ہے۔ انسان کے لیے دماغ اور روح قدرت کا خاص عطیہ ہے[1]۔

ورنڈیل کا نظریہ مسئلہ ارتقار کا بالکل معکوس ہے وہ کہتا ہے کہ انسان تمام جانداروں کی اصل ہے انسان سے بن مانس کی شکل کا حیوان بنا، بن مانس سے بندر نے ظہور کیا۔ بندر سے دوسرے دودھ پلانے والے جانوروں کی نسل پھیلی اور اُن سے ریڑھ کی ہڈی والے ہوام الارض اور پھر بے ریڑھ کی ہڈی والے کیڑوں مکوڑوں کی پیدائش عمل میں آئی[2]۔

انتخاب طبعی (نیچرل سلیکشن) جو مسئلہ ارتقار کی بنیاد ہے حکمار کے نزدیک خود مشکوک ہے اور اُس کی حیثیت تھیوری سے زیادہ نہیں ہے[3]۔ اس کے بعد ہم پھر اپنے اس قول کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ کونسی علمی حقیقت ہے جو اسلام سے متصادم ہوتی ہے؟ وہ کونسا تجربہ اور مشاہدہ ہے، جس کی تکذیب اسلام نے کی ہے؟ جلدی میں تھیوری پیش نہ کیجیے، بلکہ مقابلہ پر Scintific Fact لائیے ورنہ یہ شور بلند کرنے سے کیا فائدہ کہ اسلام کے نظریات تجربہ اور مشاہدہ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے! یا یہ زمانہ تجربہ اور مشاہدہ کا ہے، ایمان بالغیب کا نہیں ہے!

آخری اور اہم نکتہ ہم اپنے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک آخری اور اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس مضمون کی ابتدائی سطور پر ایک نظر اور ڈال لیں۔ یہ جو بار بار تجربہ اور مشاہدہ کا شور بلند کیا جاتا ہے یہ آخر ہے کیا چیز؟ کیا تعلیم یافتہ اور روشن خیال حضرات نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے جو چیز سب سے زیادہ بار بار مشاہدہ میں آتی ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ عقل کے خلاف

---

[1] لمی ٹیشن آف سائنس ص ۱۳۱

[2] Scientific World ص ۳۰۲

[3] لمی ٹیشن آف سائنس ص ۱۶۶

(یا زیادہ صحیح لفظوں میں مافوق العقل) بھی وہی چیز ہے اور اسے عقل کے خلاف سمجھ کر حیرت کا اظہار اس لیے نہیں کیا جاتا کہ بار بار کا مشاہدہ اُس کی ندرت اور اعجازی رفتار کے لیے پردہ پوش بن جاتا ہے۔ ہم روزانہ جن چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اگر ہم اُن کی عقلی توجیہ کرنا چاہیں تو تمام عقلی قویٰ جواب دے بیٹھینگے۔ اور ہم اُن کی کنہ اور حقیقت کا ادراک نہ کر سکینگے۔

آپ ذرا گہرے غور و فکر کے ساتھ اس مثال پر غور کیجیے۔ اجسام ذوی الاعضاء میں سے انسان کچھ سال زندہ رہ کر مرجاتا ہے۔ مٹی اُسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی رطوبت چوس لیتی ہے اور زندگی کا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑتی۔ آخر ایک معینہ وقت کے بعد (لا یعلمہا الا ھو) اس میں زندگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور وہ انسانی زندگی کے جملہ لوازمات سے مسلح ہو کر پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یہ ہے حیات بعد الممات کا "ناقابل فہم" مسئلہ!

دوسری طرف اجسام ذوی الاعضاء میں سے جامن کا ایک تخم ہے جو کچھ روز زندہ رہ کر نمو و ترقی کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ مٹی اسے بھی اپنے ساتھ ملا کر مٹی بنا دیتی ہے اور اس میں زندگی اور نمو کا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑتی، لیکن ایک عرصۂ معینہ کے بعد وہ تخم زمین سے سر نکالتا ہے۔ نرم نرم پتے ہوا اور سورج میں پرورش پاتے ہیں، وہ بڑھتا ہے، زندگی کے آثار ظاہر کرتا ہے اور ایک وقت میں جا کر تناور درخت بن جاتا ہے اور محض درخت ہی نہیں بلکہ ثمر دار درخت، سایہ دار درخت، بڑا اور عظیم الشان درخت!۔

غور کر کے بتائیے کہ اجسام ذوی الاعضاء کی ان دو صورتوں میں زندگی اور موت کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟ پہلی زندگی سے انکار کیوں ہے اور دوسری زندگی عقل کے مطابق کیوں نظر آتی ہے؟ کیا تخم کے نشو و نما اور زندگی کی کوئی عقلی توجیہ بتائی جا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو انسان کی دوبارہ زندگی پر اس قدر حیرت کا اظہار کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہے کہ نباتات کی زندگی اور موت ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے اس لیے ہم اُسے نہ خلاف عقل سمجھتے ہیں اور نہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ روز کا مشاہدہ تجھ کی دوبارہ زندگی کے لیے پردہ پوش بن گیا ہے۔ مگر انسان کی دوبارہ زندگی پر حیرت کا اظہار صرف اس لیے کیا جارہا ہے کہ اس کا ہم نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا اس لیے نہیں کہ وہ خلاف عقل اور ادراک کی سرحد سے ماوراء ہے بلکہ اس لیے کہ یہ حالت ہمارے مشاہدہ میں کبھی نہیں آئی۔ اس مثال پر آپ اور سیکڑوں مثالوں کا اضافہ کیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ عقل کو غلط اور بے محل استعمال کرنا اگر عقلی فساد نہیں تو اور کیا ہے؟

اسی ضمن میں ابھی ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ جو چیز ہمارے مشاہدہ میں آرہی ہے اور فوق العقل کیفیات کی حاصل ہے۔ اگر آپ اسے عقل کے مطابق یا فہم کے نزدیک لانے کی کوشش کرینگے۔ تو وہ اس حالت میں فوراً عقل کے خلاف متصور ہوگی۔ اور بجائے حیرت رفع ہونے کے دماغ حیرت و استعجاب کی جولانگاہ بن جائیگا۔

کسی چیز کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ زیادہ حیرت انگیز ہے یا کسی چیز کی رفتار دو لاکھ میل فی سکنڈ؟ بظاہر عقل کا فیصلہ یہ ہوگا کہ دو لاکھ میل فی سکنڈ کی جگہ ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار اقرب الی الفہم ہے لیکن جانتے ہو کہ بجلی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ اگر کوئی شخص اسے اقرب الی الفہم بنانے کے لیے یہ کہہ دے کہ بجلی کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہے تو بجائے حیرت رفع ہونے کے زیادہ حیرت لاحق ہوگی اور اس اقرب الی الفہم رفتار کو ابعد من الفہم قرار دینے میں کوئی تامل نہیں کیا جائیگا! آخر یہ بات کیا ہے کہ بجلی کی دو لاکھ میل فی سکنڈ کی رفتار پر حیرت نہیں کی جاتی اور اس کی ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار پر حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ دو لاکھ میل فی سکنڈ کی رفتار بجلی کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اگر اُسے ختم کر دیا جائے تو پھر بجلی، بجلی نہیں رہتی بلکہ بیل گاڑی بن جاتی ہے اور مشاہدہ و تجربہ بھی اس کے تسلیم کرنے سے ابا کرتا ہے۔ اگر انسان کی دوبارہ زندگی بھی بار بار مشاہدہ میں آتی رہتی اور اُس وقت کوئی یہ کہتا کہ مرکر انسان پھر کبھی زندہ نہیں ہوتا تو اُسے یقیناً احمق قرار دیا جاتا اور زندہ ہونے پر نہیں بلکہ زندہ نہ ہونے پر ہر شخص حیرت کا اظہار کرتا!

ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بلندی سے اولے گرتے ہیں۔ پانی برستا ہے اور بعض وقت مینڈک اور مچھلیاں بھی بارش کے ساتھ تشریف لے آتی ہیں۔ اگر انسانی پیدائش کی صورت بھی یہ ہوتی کہ مخصوص اوقات و حالات اور موسموں میں دس دس گیارہ گیارہ سال کے بچے ہوا کا سہارا لے کر بلندی سے زمین پر نزول کرتے اور اُس وقت ہمیں کوئی شخص یہ داستان سُناتا کہ کسی ملک میں بچوں کی پیدائش پانی (مادہ منویہ) سے ہوتی ہے۔ وہ بے جان پانی عورت کے پیٹ میں داخل کیا جاتا ہے وہاں اُس کی پرورش ہوتی ہے۔ اس پانی پر آنکھیں بنتی ہیں، اُس میں کان کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ اور اس میں چہرہ، مُنہ، زبان، دانت دماغ، رگیں، دل و گردہ، خون، ہڈی، گوشت، دست و پا، غرض ایک ایک عضو اس پانی سے بنتا ہے۔ اور جب اس قطرہ کا وزن ایک پونڈ کے قریب پہنچ جاتا ہے تو اس میں زندگی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے، زندگی کو کالی کوٹھری میں ہوا کی ضرورت نہیں پڑتی اور جب وہ مکمل انسان بن جاتا ہے تو باہر نکل کر سانس بھی لیتا ہے، دودھ بھی پیتا ہے۔ بصارت، سماعت سے بھی کام لیتا ہے اور حواس ظاہری و باطنی کو ابتدائی درجہ میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے! بتائیے ایسے زمانہ میں جس کا ہم نے ذکر کیا کونسی بات عقل کے خلاف اور کونسی عقل کے مطابق نظر آتی ہے! اقرب الی الفہم پہلی صورت کو قرار دیا جاتا کیونکہ وہ ہمارے مشاہدہ اور تجربہ کے مطابق ہوتی اور دوسری صورت کو "دقیانوسیت" اور قصہ کہانی پر محمول کیا جاتا پیدائش کی یہ دوسری صورت یقیناً فوق العقل ہے، مگر آج! اس فوق العقل صورت کو مطابق عقل اور اقرب الی الفہم قرار دیا جاتا ہے اور پہلی صورت کو خلاف عقل یا خلاف تجربہ و مشاہدہ! وجہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ پانی کے قطرہ سے انسانی پیدائش بے انتہا حیرت انگیز ہے مگر مشاہدہ نے اس پر موٹا پردہ ڈال دیا ہے اور ہم سمجھتے یہ ہیں کہ اس طرز کی پیدائش میں کوئی ندرت کوئی حیرت اور کوئی اعجاز نہیں ہے! اب بار بار غور کرو اس آیۂ کریمہ پر!

بل کذّبوا بما لم یحیطوا بعلمہٖ جس چیز کا وہ ادراک اور احاطہ نہ کر سکے اُس کی تکذیب پر آمادہ ہو گئے۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ!